ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 427

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: پاکستانی ادب (427) • سطح: بی۔اے

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: سفرنامے میں داخلی کیفیات کی فوقیت اور اہم سفرنامہ نگار (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سفرناموں میں محض منظر کشی کے بجائے "داخلی کیفیات" اور مشاہدات کو کیوں فوقیت دی جا رہی ہے؟ نیز پاکستانی دور کے اہم سفرنامہ نگاروں کا تعارف کرائیں۔

(20)

تعارف

سفر نامہ وہ نثری صنف ہے جس میں مصنف اپنے سفر کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو ادبی انداز میں بیان کرتا ہے۔ یہ بیک وقت دستاویز بھی ہے اور ادب بھی: اس میں ملکوں، شہروں اور لوگوں کی معلومات بھی ملتی ہیں اور ایک حساس انسان کا ذاتی تجربہ بھی۔ جدید دور میں سفر نامے کی طبیعت نمایاں طور پر بدلی ہے۔ پرانا سفر نامہ زیادہ تر راستوں، فاصلوں، عمارتوں اور مناظر کی تفصیل پر مبنی ہوتا تھا، مگر آج کا قاری محض منظر کشی پر قانع نہیں ہوتا؛ وہ جاننا چاہتا ہے کہ ان مناظر نے مسافر کے دل و دماغ پر کیا اثر چھوڑا اور اس نے وہاں کے انسانوں اور تہذیب کو کس نظر سے دیکھا۔ اس سوال میں پہلے اس تبدیلی کی وجوہات بیان کی جائیں گی اور پھر پاکستانی دور کے اہم سفر نامہ نگاروں کا تعارف پیش کیا جائے گا۔

داخلی کیفیات کو فوقیت کی وجوہات

اس تبدیلی کی پہلی وجہ ٹیکنالوجی ہے۔ آج تصویر، ویڈیو اور انٹرنیٹ نے دنیا کے ہر منظر کو ہر شخص کی پہنچ میں کر دیا ہے؛ قاری کسی شہر یا مقام کو لکھے ہوئے بیان سے پہلے سکرین پر دیکھ چکا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سفر نامہ نگار کے پاس دینے کے لیے صرف وہی چیز رہ جاتی ہے جو کیمرہ نہیں دے سکتا، یعنی اس کا اپنا احساس، اس کی حیرت، خوشی، تنہائی، اجنبیت اور سوالات۔ دوسری وجہ قاری کے مزاج کی تبدیلی ہے: جدید قاری معلومات کے بجائے تجربہ چاہتا ہے، وہ سفر کو مسافر کی آنکھ اور دل سے جینا چاہتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر اب عام ہو چکا ہے؛ ہوائی جہاز اور سہولتوں نے ہزاروں لوگوں کو مسافر بنا دیا ہے، اس لیے معمولی مقامات کی فہرست کے بجائے انوکھا زاویۂ نظر ہی سفر نامے کو منفرد بناتا ہے۔

چوتھی وجہ تہذیبی اور فکری ہے۔ جدید انسان کے لیے سفر محض سیاحت نہیں بلکہ خود کو اور اپنے سماج کو دوسروں کے آئینے میں دیکھنے کا موقع ہے۔ جب سفر نامہ نگار کسی دوسرے ملک کی صفائی، قانون پسندی، وقت کی پابندی یا سماجی رویوں پر اپنی داخلی کیفیت بیان کرتا ہے تو اس کے ساتھ اپنے وطن پر خاموش تنقید بھی کر رہا ہوتا ہے اور قاری اس موازنے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ پانچویں وجہ ادب کے عمومی مزاج کی تبدیلی ہے: جس طرح افسانہ واقعے سے نفسیات کی طرف اور شاعری بیان سے علامت کی طرف

بڑھی، اسی طرح سفر نامہ بھی بیرونی بیان سے داخل کی طرف مڑ گیا۔ داخلی کیفیات سفر نامے کو خشک رپورٹ سے بچا کر اسے زندہ، ذاتی اور پائیدار ادب بناتی ہیں، اسی لیے آج سفر نامے کی کامیابی کا پیمانہ مناظر کی تعداد نہیں بلکہ تاثرات کی گہرائی ہے۔

پاکستانی دور کے اہم سفر نامہ نگار

پاکستانی دور میں سفر نامے کو سب سے زیادہ مقبولیت مستنصر حسین تارڑ نے بخشی۔ ان کے سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں"، "خانہ بدوش"، "سنو لیک" اور "نانگا پربت" وغیرہ قاری کو سیر بھی کراتے ہیں اور سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ تارڑ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پہاڑوں، دریاؤں اور دور دراز علاقوں میں انسان اور قدرت کے تعلق کو فلسفیانہ داخلی کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں؛ ان کا سفر جغرافیے سے زیادہ روح کی تلاش بن جاتا ہے۔ ابنِ انشا کا انداز اس سے بالکل الگ ہے: "چلتے ہو تو چین کو چلیے" اور "دنیا گول ہے" میں ظرافت، بے تکلفی اور لطیف مشاہدہ ان کے سفر ناموں کو انشائیے کی شگفتگی عطا کرتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ سفر نامہ سنجیدہ معلومات کے بغیر بھی قاری کو دنیا دکھا سکتا ہے، صرف زاویۂ نظر دلچسپ ہونا چاہیے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے "شوقِ آوارگی" سمیت ان کے کالموں اور تحریروں میں مزاح اور سماجی مشاہدہ یکجا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کی "سات سمندر پار" پاکستانی خواتین کی سفر نامہ نگاری میں سنگِ میل ہے جس میں ایک سفیر کی اہلیہ کے مشاہدات داخلی حساسیت کے ساتھ پیش ہوئے۔ رضا علی عابدی نے برطانیہ اور دیگر ملکوں کے سفر ناموں اور ریڈیائی تحریروں میں ثقافتی موازنے اور زبان کی شستگی کو ملایا؛ ان کا مشاہدہ تاریخی گہرائی رکھتا ہے۔ اشفاق احمد، حکیم محمد سعید، قدرت اللہ شہاب اور دوسرے کئی مصنفین نے بھی اپنے اسفار کو خود نوشت و تحریروں میں ادبی رنگ دیا۔ جاپان، چین، یورپ، امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے سفر ناموں نے پاکستانی قاری کی دنیا سے واقفیت بڑھائی اور اس صنف کو پاکستانی ادب کی مستقل اور محبوب صنف بنا دیا۔ ذیل کی جدول چند اہم ناموں کا خلاصہ پیش کرتی ہے:

جدول: پاکستانی دور کے اہم سفر نامہ نگار

اسلوب کی خصوصیت	نمایاں تحریر / کتاب	سفر نامہ نگار
قدرت سے مکالمہ، فلسفیانہ داخلی کیفیت	نکلے تیری تلاش میں، خانہ بدوش، سنو لیک	مستنصر حسین تارڑ
ظرافت، بے تکلفی اور لطیف مشاہدہ	جلتا ہو تو چین کو چلیے، دنیا گول ہے	ابنِ انشا
نسائی حساسیت اور سفارتی مشاہدہ	سات سمندر پار	بیگم اختر ریاض الدین
مزاح کے ساتھ سماجی و ثقافتی جائزہ	شوقِ آوارگی	عطاء الحق قاسمی
ثقافتی موازنہ، تاریخی گہرائی، شستہ زبان	سفر نامے و ریڈیائی تحریریں	رضا علی عابدی

سفر نامے کی سماجی افادیت

سفر نامے میں داخلی کیفیات کی فوقیت کا ایک اور فائدہ اس کی سماجی افادیت ہے۔ جب سفر نامہ نگار دوسرے ملکوں کے تعلیمی نظام، صحت کی سہولتوں، ٹریفک کے نظم و ضبط، ماحول کی صفائی اور عوامی رویوں کو اپنی کیفیت کے ساتھ بیان کرتا ہے تو قاری صرف معلومات نہیں حاصل کرتا بلکہ اپنے سماج پر نظر ثانی کی ترغیب بھی پاتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ ایک طرح کی غیر رسمی قومی تربیت بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ سفر نامے جو صرف ہوٹلوں، بازاروں اور سیاحتی مقامات کی فہرست پر ختم ہو جاتے ہیں، چند دنوں میں بھلا دیے جاتے ہیں، کیونکہ ان میں قاری کی زندگی بدلنے والا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ داخلی کیفیت والے سفر نامے دیرپا اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کا اصل موضوع انسان ہوتا ہے اور انسانی احساس کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ مستنصر حسین تارڑ کے پہاڑی سفر ہوں یا ابنِ انشا کی مزاحیہ سیر، دونوں صورتوں میں قاری اس ملک نہیں پہنچتا جہاں مصنف گیا تھا بلکہ اس جذبے تک پہنچتا ہے جو مصنف وہاں سے لے کر آیا تھا۔ یہی منتقلی ادب کی کامیابی کہلاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج کے ناشر، مدیر اور قاری تینوں سفر نامے میں مصنف کی شخصیت اور اس کے باطنی تجربے کو تلاش کرتے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سفر نامے میں داخلی کیفیات اور مشاہدات کو فوقیت اس لیے ملی کہ ٹیکنالوجی نے منظر کشی کی انفرادیت ختم کر دی، قاری کا مزاج تجربے کی طلب کرنے لگا اور خود سفر کا مفہوم سیاحت سے بڑھ کر خود شناسی اور تہذیبی موازنے تک پھیل گیا۔ پاکستانی سفر نامہ نگاروں خصوصاً مستنصر حسین تارڑ، ابنِ انشا، عطاء الحق قاسمی، اختر ریاض الدین اور رضا علی عابدی نے اس رجحان کو اپنے اپنے اسلوب سے آگے بڑھایا، یہی وجہ ہے کہ آج اچھا سفر نامہ وہی سمجھا جاتا ہے جو قاری کو جگہوں کے ساتھ انسانوں تک اور مناظر کے ساتھ معنوں تک لے جائے۔

سوال نمبر 2: نظم کی بنت، مرکزی خیال اور تسلسل، پاکستانی نظم نگار (20 نمبر)

سوال نمبر 2: نظم کی بنت میں "مرکزی خیال" اور "تسلسل" کی اہمیت واضح کریں، نیز پاکستانی دور کے اہم نظم نگاروں پر نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

نظم شعری اظہار کی وہ صنف ہے جس میں شاعر کسی ایک موضوع، تجربے یا خیال کو ایک مربوط وحدت میں پیش کرتا ہے۔ غزل سے نظم کا بنیادی فرق یہی ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل اور الگ ہو سکتا ہے، مگر نظم کے تمام حصے ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے اور ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ نظم کی اسی ساخت کو "بنت" کہا جاتا ہے، اور اس بنت کی جان دو چیزیں ہیں: مرکزی خیال اور تسلسل۔ اس سوال میں پہلے ان دونوں کی اہمیت واضح کی جائے گی اور پھر پاکستانی دور کے اہم نظم نگاروں پر نوٹ لکھا جائے گا جنہوں نے اس صنف کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

مرکزی خیال کی اہمیت

مرکزی خیال سے مراد وہ بنیادی تصور، جذبہ یا پیغام ہے جس کے گرد پوری نظم تعمیر ہوتی ہے۔ نظم خواہ محبت پر ہو، احتجاج پر، فطرت پر یا کسی تاریخی واقعے پر، اس کا ایک محور ضرور ہوتا ہے جس سے ہر مصرعہ اور ہر بند تعلق رکھتا ہو۔ مرکزی خیال نظم کو وحدت عطا کرتا ہے؛ اگر یہ نہ ہو تو نظم محض خوبصورت مصرعوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ مرکزی خیال ہی شاعر کے مواد کے انتخاب کو کنٹرول کرتا ہے: کون سی تشبیہ آئے گی، کون سی علامت استعمال ہو گی اور نظم کس جذباتی رنگ میں اختتام پائے گی، یہ سب اسی سے طے ہوتا ہے۔ قاری کے ذہن میں نظم کا جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ بھی اسی مرکزی خیال کی صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ اسی لیے نقاد نظم کی کامیابی کا پہلا پیمانہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا مرکزی خیال واضح، مضبوط اور نظم کے تمام حصوں میں سانس لیتا ہوا ہے یا نہیں۔

تسلسل کی اہمیت

تسلسل سے مراد نظم کے اجزا کا وہ منطقی و جذباتی ربط ہے جس سے خیال ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف اس طرح بڑھتا ہے کہ قاری کو کہیں الجھن یا خلاء محسوس نہ ہو۔ تسلسل کی کئی صورتیں ہیں: واقعاتی تسلسل جس میں قصہ ترتیب سے آگے بڑھتا ہے، جذباتی تسلسل جس میں احساس شدت پکڑتا ہوا عروج کو پہنچتا ہے، اور فکری تسلسل جس میں دلیل سے دلیل نکلتی ہے۔ تسلسل نہ ہو تو نظم بکھر جاتی ہے، قاری کا دھیان اجڑ جاتا ہے اور شاعر کا مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ پابند نظم میں بحر، ردیف و قافیہ تسلسل کو صوتی سہارا دیتے ہیں، جبکہ آزاد نظم میں، جہاں یہ سہارے موجود نہیں ہوتے، تسلسل کی ذمہ داری پوری طرح خیال کے ربط اور داخلی آہنگ پر آ جاتی ہے، اسی لیے آزاد نظم لکھنا بظاہر آسان مگر درحقیقت مشکل فن ہے۔ مرکزی خیال اور تسلسل کا تعلق باہمی ہے: مرکزی خیال نظم کا مقصد ہے اور تسلسل اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ؛ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے۔

پاکستانی دور کے اہم نظم نگار

پاکستانی دور میں نظم کو سب سے بڑی وسعت فیض احمد فیض نے دی۔ "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"، "محبت" جیسی نظموں سے لے کر "نسخہ ہائے وفا" کی غزلوں و نظموں تک فیض نے ذاتی محبت کو اجتماعی درد سے جوڑ کر نظم میں ایک نیا آفاق پیدا کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے نظم میں دیہی زندگی، انسانی ہمدردی اور اخلاقی اقدار کو اپنا موضوع بنایا اور ان کی نظمیں سادگی کے باوجود گہرا اثر رکھتی ہیں۔ جدید نظم کے بانیوں میں ن م راشد کا مقام سب سے نمایاں ہے جنہوں نے آزاد نظم کو فلسفیانہ اور علامتی گہرائی دی؛ ان کی نظم "حسن کوزہ گر" جدید انسان کی معنوی تلاش کی عمدہ مثال ہے۔ میراجی نے اسی روایت کو نفسیاتی اور باطنی رنگ دیا، گو ان کا انتقال قیامِ پاکستان کے قریب ہوا مگر ان کا اثر پاکستانی نظم پر دائم ہے۔

احمد فراز نے رومان اور احتجاج کو ملا کر نظم کو عوامی مقبولیت بخشی؛ "محاصرہ" جیسی نظمیں جبر کے خلاف آواز بن گئیں۔ منیر نیازی کی نظموں میں جنگل، شام، تنہائی اور موت کی پراسرار علامتیں نمایاں ہیں جن سے وہ اردو کے منفرد لہجے کے شاعر بنے۔ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے نسائی تجربے کو نظم کا موضوع بنا کر مرد مرکوز ادبی روایت میں نئی، جرات مندانہ آواز شامل کی۔ امجد اسلام امجد نے آسان زبان اور جذباتی صداقت سے گیت نما نظموں کو مقبول کیا، جبکہ افتخار عارف، انور مسعود اور دوسرے کئی شاعروں نے بھی اپنے اپنے رنگ سے پاکستانی نظم کے ذخیرے کو ثروت مند کیا۔ ان تمام شاعروں کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ مضبوط مرکزی خیال اور پختہ تسلسل نظم کو وقتی تفریح سے بڑھا کر قوم کی اجتماعی یادداشت کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

مرکزی خیال اور تسلسل: عملی تنقید کی روشنی میں

عملی مثالوں سے یہ بات زیادہ واضح ہوتی ہے۔ فیض کی مشہور نظم کا مرکزی خیال اپنے عہد کے جبر کے باوجود امید کا بقائے دوام ہے اور یہ خیال نظم کے ہر بند میں بدلتے رنگ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے؛ کہیں یہ ماضی کی یاد بنتا ہے، کہیں حال کی تصویر اور کہیں مستقبل کا وعدہ۔ اس کے برعکس کمزور نظموں میں یہ عیب عام نظر آتا ہے کہ شاعر خوبصورت مصرعے تو کہہ لیتا ہے مگر ان کا کوئی مرکز نہیں ہوتا، نتیجتاً نظم اختتام پر قاری کو کسی مجموعی تاثر کے بغیر چھوڑ جاتی ہے۔ نظم کے نقاد اسی کمزوری کو "بے رابطگی" کہتے ہیں۔ آزاد

نظم میں یہ مسئلہ اور بھی نازک ہے کیونکہ وہاں نہ ردیف ہے نہ قافیہ جو اشعار کو باندھ کر رکھے؛ وہاں تسلسل ہی نظم کا ڈھانچہ ہے۔ اسی لیے ن م راشد اور بعد کے جدید نظم نگاروں نے داخلی آہنگ اور علامتوں کے تکرار سے تسلسل پیدا کرنے کی تکنیک اپنائی۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ نظم نگار کو چاہے موضوع ذاتی ہو یا سماجی، اسے نظم لکھنے سے پہلے اپنے مرکزی خیال کی وضاحت اپنے ذہن میں کر لینی چاہیے اور پھر ہر حصے کو اسی خیال سے جوڑتے رہنا چاہیے۔ یہی شعور ایک عام شاعر کو نظم کا فنکار بناتا ہے اور نظم کو قاری کی یادداشت میں دیرپا مقام دیتا ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مرکزی خیال اور تسلسل نظم کی بنت کی دو بنیادی شرائط ہیں: مرکزی خیال نظم کو وحدت، سمت اور مفہوم دیتا ہے اور تسلسل اس مفہوم کو قاری تک منظم اور پُراثر انداز میں پہنچاتا ہے۔ پاکستانی نظم نگاروں نے فیض و قاسمی کی روایت، راشد و میراجی کی جدیدیت اور بعد کے شاعروں کے سماجی و نسائی شعور کو ملا کر نظم کو اردو شاعری کی سب سے زندہ صنف بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پاکستانی سماج کے بڑے تجربات سیاسی احتجاج ہو یا ذاتی تنہائی سب سے زیادہ نظم ہی میں محفوظ نظر آتے ہیں۔

سوال نمبر 3: پاکستانی دور کی غزل — کلاسیکی روایت اور جدید حسیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3: پاکستانی دور کی غزل میں کلاسیکی روایت کی پاسداری اور جدید حسیت کا امتزاج کس حد تک نظر آتا ہے؟ اس دور کی غزل کے فنی خصائص کا جامع جائزہ لیں۔ (20)

تعارف

غزل اردو شاعری کی سب سے محبوب اور پائیدار صنف ہے۔ اس کی عمر صدیوں پر محیط ہے، مگر اس کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ یہ ہر دور میں خود کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے باوجود اپنی پہچان برقرار رکھتی ہے۔ پاکستانی دور کی غزل اس کشمکش کی بہترین مثال ہے: ایک طرف میر و غالب کی قائم کردہ کلاسیکی روایت، اس کے بحور و اوزان، ردیف و قافیہ،

محبوب و رقیب اور ساقی و مے کے استعارے ہیں، اور دوسری طرف جدید شہری زندگی، سیاسی جبر، مادیت، شناخت کے بحران اور نسائی شعور کی نئی حسیت ہے۔ اس سوال میں اس امتزاج کا جائزہ لے کر اس دور کی غزل کے فنی خصائص بیان کیے جائیں گے۔

کلاسیکی روایت کی پاسداری

پاکستانی غزل نے سب سے پہلے صنفی ڈھانچے کی مکمل پاسداری کی: مطلع، مقفیٰ اشعار، بحر و وزن کی پابندی اور تغزل کا مزاج آج بھی اس غزل کی پہچان ہے۔ موضوعات کی سطح پر بھی کلاسیکی عناصر زندہ رہے: محبوب کی بے وفائی، ہجر و وصال، مے و ساقی، گل و بلبل اور رقیب کی ریشہ دوانیاں بیسویں صدی کے آخر تک غزل میں موجود رہیں۔ ناصر کاظمی کی غزل اس پاسداری کی خوبصورت مثال ہے جنہوں نے کلاسیکی لہجے میں شہر آشوب اور ذاتی اداسی کو ایسے ملایا کہ روایت تازہ ہو گئی۔ فیض احمد فیض نے بھی کلاسیکی استعاروں یعنی مے، ساقی، دل اور قفس کو نئے سیاسی و سماجی مفاہیم دے کر یہ ثابت کیا کہ روایت کے قالب میں انقلاب بھی ڈھل سکتا ہے۔ زبان کے انتخاب، تہذیبِ الفاظ اور کلاسیکی تلمیحات کے استعمال سے یہ غزل اپنی جڑوں سے کبھی کٹی نہیں۔

جدید حسیت کا اظہار

دوسری طرف پاکستانی غزل نے جدید زندگی کو جس جرأت سے قبول کیا، وہ اس کی دوسری بڑی شناخت ہے۔ شہر کی بھیڑ، فلیٹ کی تنہائی، دفتری زندگی، ٹیلی فون و انٹرنیٹ، کرپشن، فرقہ واریت، آمریت اور جنگ جیسے موضوعات غزل میں اس طرح داخل ہوئے کہ تغزل کا مزاج برقرار رہا۔ جون ایلیا نے فلسفیانہ سوال، خود کلامی اور تلخی کو غزل کا لہجہ بنا دیا۔ احمد فراز نے محبوب کے ساتھ محکوم قوم اور محبوبِ وطن کو بھی غزل میں جگہ دی۔ پروین شاکر نے عورت کے جذبے کو اس کی اپنی زبان میں غزل میں پیش کر کے صدیوں پرانی یک طرفہ روایت کو توڑا؛ ان کی غزل میں محبوب کی جگہ حساس، سوچنے والی اور سوال کرنے والی عورت آ گئی۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور ادا جعفری جیسی شاعرات نے بھی اس نئی نسائی حسیت کو وسعت دی۔ یوں جدید حسیت کا مطلب صرف نئے موضوعات نہیں بلکہ پرانے موضوعات کو نئی آنکھ سے دیکھنا بھی ہے، اور اس میں پاکستانی غزل بہت حد تک کامیاب رہی ہے۔

اس دور کی غزل کے فنی خصائص

پاکستانی دور کی غزل کے فنی خصائص کا جامع جائزہ لیا جائے تو کئی باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اول، علامت و استعارے کی تازگی: پرانے استعاروں کو نئے مفاہیم دیے گئے اور شہر، دیوار، زنجیر، دھوپ اور آئینہ جیسی جدید علامتیں پیدا ہوئیں۔ دوم، زبان کی سادگی اور مکالماتی انداز: بھاری فارسی ترکیبوں کی جگہ رواں اردو اور روزمرہ نے لی جس سے غزل عام قاری کے قریب ہو گئی۔ سوم، انفرادی لہجوں کی کثرت: فیض کی رومانی رمز، ناصر کاظمی کی اداسی، منیر نیازی کی پراسراریت، جون ایلیا کی تلخ خود کلامی اور پروین شاکر کی نسائی نرمی ہر شاعر کی الگ پہچان بنی۔ چہارم، فنی تجربات: آزاد غزل، غزل نما اور طویل اشعار کے تجربات ہوئے، گو مرکزی دھارا پابند ہیئت ہی رہا۔ پنجم، مشاعرے اور میڈیا نے غزل کی کارکردگی والی صورت کو بڑھاوا دیا جس سے بعض جگہ وقتی داد کے لیے سطحیت بھی آئی۔ مجموعی طور پر یہ دور غزل کے لیے سنہرا دور کہا جا سکتا ہے جس میں روایت اور جدت کا امتزاج کم و بیش ستر فیصد تک کامیاب نظر آتا ہے؛ کہیں کہیں جدت کے شوق میں تغزل کمزور بھی ہوا، مگر بحیثیت مجموعی غزل نے خود کو زندہ اور دور ساز صنف ثابت کیا۔

اس امتزاج کی حدود اور تنقیدی مباحث

اس خوش آئند امتزاج کے ساتھ چند تنقیدی سوالات بھی وابستہ ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مشاعرے کی مقبولیت نے غزل کو داد طلبی کی صنف بنا دیا، جس سے بہت سے شعرا نے خیال کی گہرائی کے بجائے بازی گری اور سطحی شعر گوئی اختیار کی۔ دوسرا نکتہ یہ اٹھایا جاتا ہے کہ جدید موضوعات کی دوڑ میں بعض شعرا نے تغزل کی وہ لطافت کھو دی جو غزل کی روح ہے، یہاں تک کہ کچھ تحریریں نعرے اور غزل کے درمیان معلق رہ گئیں۔ تیسرا سوال زبان کا ہے: جدید الفاظ اور انگریزی ترکیبوں کے بے محل استعمال نے کہیں کہیں غزل کی تہذیبی آواز کو کمزور بھی کیا۔ ان تنقیدوں کے باوجود مجموعی صورت حال حوصلہ افزا ہے، کیونکہ ہر دور میں چند بڑے شعرا نے ان کمزوریوں سے اوپر اٹھ کر وہ معیار قائم رکھا جس سے صنف کی سمت درست رہتی ہے۔ اساتذہ کا کام بھی یہی رہا ہے کہ انہوں نے نوجوان شعرا کو روایت کے مطالعے کی طرف بلایا اور جدت کو محض فیشن بننے سے روکا۔ یوں امتزاج کا تناسب جگہ جگہ مختلف سہی، مگر پاکستانی غزل کی عمومی سمت یہی رہی کہ پرانی شراب نئی بوتل میں نہیں، بلکہ نئی شراب پرانی صراحی کی انفرادیت کے ساتھ پیش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی اردو دنیا میں پاکستانی غزل آج بھی ایک نمایاں اور معتبر حوالہ سمجھی جاتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستانی دور کی غزل نے کلاسیکی روایت کو جمود کی طرح نہیں بلکہ بنیاد کی طرح استعمال کیا اور جدید حسیت کو اس بنیاد پر تعمیر کیا۔ اس امتزاج نے غزل کو بیک وقت کلاسیک کی وقعت بھی دی اور عصرِ حاضر کی زبان بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی غزل آج بھی مشاعروں، موسیقی اور عام زندگی میں زندہ ہے اور نئی نسل کے شعرا اسی روایت و جدت کے توازن سے اپنا راستہ بنا رہے ہیں۔ یہ توازن بتاتا ہے کہ کوئی صنف اسی وقت زندہ رہتی ہے جب وہ ماضی کا احترام اور حال کی سچائی دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔

سوال نمبر 4: پاکستان میں اردو تنقید کی نئی جہتیں اور جدید تنقیدی نظریات (20 نمبر)

سوال نمبر 4: پاکستان میں اردو تنقید نے کن نئے فکری اور فنی جہتوں کو اپنایا ہے؟ جدید تنقیدی نظریات نے اردو ادب کی تفہیم میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ مدلل جواب تحریر کریں۔ (20)

تعارف

تنقید ادب کا وہ شعور ہے جو فن پارے کو پرکھتا، اس کی خوبیاں و خامیاں بیان کرتا اور مصنف و قاری دونوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اردو تنقید کی بنیاد حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" اور شبلی کی موازنہ نویسی سے پڑی تھی، مگر قیامِ پاکستان کے بعد اس علم نے غیر معمولی وسعت اختیار کی۔ نئے ملک کی فکری ضروریات، جامعات کی توسیع، غیر ملکی ادب کے تراجم اور مغربی نظریات کی آمد نے پاکستانی تنقید کو کئی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اس سوال میں پہلے ان جہتوں کا تعارف کرایا جائے گا اور پھر یہ مدلل جائزہ لیا جائے گا کہ جدید تنقیدی نظریات نے اردو ادب کی تفہیم میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

پاکستانی تنقید کی نئی فکری و فنی جہتیں

پاکستان میں تنقید کی پہلی نئی جہت جدیدیت کا مطالعہ بنی۔ محمد حسن عسکری نے مغربی ادب و تنقید کو اردو قاری سے متعارف کرایا اور فن پارے کی فنی ساخت کو موضوع پر فوقیت دی۔ ان کی تنقید نے اردو میں جدید شعر و افسانے کو سمجھنے کی فکری بنیاد فراہم کی۔ دوسری جہت نفسیاتی تنقید کی ہے جس نے منٹو، میراجی اور دوسرے مصنفین کے فن کو ذہن و لاشعور کے تجزیے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ تیسری جہت سماجی و مارکسی تنقید ہے جس نے ادب کو طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ نظام اور معاشی حالات سے جوڑ کر پڑھا؛ ترقی پسند روایت کے بعد یہ انداز زیادہ سائنسی بنیادوں پر آگے بڑھا۔ چوتھی جہت اسلوبیاتی اور لسانی تنقید ہے جس میں متن کی زبان، ساخت اور تکنیک کو مرکز بنایا گیا۔ وزیر آغا نے علامت نگاری اور انشائیہ تنقید کو نئی پہچان دی، جبکہ سلیم اختر نے اردو تنقید کی تاریخ لکھ کر اس پورے سفر کو دستاویزی شکل دی۔ آل احمد سرور، کلیم الدین احمد اور جیلانی کامران جیسے نقادوں نے بھی اپنے اپنے انداز سے اس میدان کو ثروت مند کیا۔

بعد کے عرصے میں تنقید کی جہتیں مزید متنوع ہو گئیں: نسائی تنقید نے ادب میں عورت کی نمائندگی اور خواتین مصنفین کے تجربے کو مرکز بنایا، مابعد جدیدیت نے کثرتِ مفاہیم اور قاری کی آزادی کی بات کی، اور تحقیق و تدوین کی تنقیدی جہت نے قدیم متون کو نئے سرے سے مرتب و مدون کیا۔ جامعات میں ایم فل و پی ایچ ڈی کی تحقیق نے مخصوص مصنفین اور ادوار پر گہرے مطالعات پیدا کیے۔ یہ تمام جہتیں مل کر پاکستانی تنقید کو تاثراتی تبصرے سے نکال کر باقاعدہ علم کی صورت دے گئیں۔

جدید تنقیدی نظریات کا تفہیمِ ادب میں کردار

جدید تنقیدی نظریات نے اردو ادب کی تفہیم میں بنیادی کردار یہ ادا کیا کہ قاری کا اختیار بڑھ گیا اور متن کے مفاہیم یک معنی ہونے کے بجائے کثیر المعنی تسلیم کیے جانے لگے۔ ساختیات نے سکھایا کہ فن پارہ اپنی ساخت اور علامتوں کے نظام سے پڑھا جائے؛ اس سے حالی، اقبال اور میراجی جیسے تخلیق کاروں کے فن کے نئے رخ کھلے۔ پس ساختیات اور بُنت شکنی نے یہ بتایا کہ متن میں معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں اور مصنف کی نیت ہی حتمی فیصلہ نہیں ہوتی۔ مارکسی و سماجی نظریات نے ادب کو سماج سے جوڑ کر پریم چند، منٹو اور قاسمی جیسے ادیبوں کی سماجی اہمیت واضح کی۔ نفسیاتی نظریات نے کرداروں کے باطن کو سمجھنے کی زبان دی۔ مابعد نو آبادیاتی تنقید نے برطانوی استعمار کے عہد کے اردو ادب کو نئے

سوالوں سے پڑھا: یہ ادب کس کے مفاد میں لکھا گیا اور اس میں مقامی آواز کس حد تک موجود ہے۔ نسائی نظریات نے صدیوں سے خاموش آدھی آبادی کے ادبی تجربے کو سنجیدہ مطالعے کا موضوع بنایا۔

ان نظریات کے چند منفی اثرات سے بھی انکار نہیں: بعض نقادوں نے نظریے کو متن پر اس طرح مسلط کر دیا کہ فن پارہ مثال بن کر رہ گیا اور تنقید عام قاری کے لیے مشکل اصطلاحات کا جنگل بن گئی۔ کہیں محض مغربی نظریات کی نقل نے مقامی مزاج کو نظر انداز کیا گیا۔ مگر بحیثیت مجموعی ان نظریات نے اردو ادب کو نیا شعور دیا: پرانے کلاسیک از سرِ نو پڑھے جانے لگے، حاشیائی آوازوں کو مقام ملا اور تنقید محض پسند و ناپسند سے بلند ہو کر فکری مکالمہ بن گئی۔ مدلل بات یہ ہے کہ جب تک نظریہ متن کی خدمت میں رہے وہ تفہیم بڑھاتا ہے اور جب متن نظریے کی خدمت میں چلا جائے تو تنقید توازن کھو بیٹھتی ہے؛ پاکستانی تنقید کی بہترین مثالوں میں یہی توازن نظر آتا ہے۔

تنقید کے ادارہ جاتی و تعلیمی اثرات

پاکستانی تنقید کی ترقی میں اداروں کا کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جامعات کے شعبہ ہائے اردو نے تنقید کو نصاب کا حصہ بنا کر اسے باقاعدہ تدریسی موضوع بنایا، ادبی جرائد نے تنقیدی مضامین کو جگہ دے کر مکالمے کو جاری رکھا اور ادبی کانفرنسوں نے مختلف مکاتبِ فکر کو آمنے سامنے بٹھا کر بحث کی روایت قائم کی۔ اس ادارہ جاتی ماحول کا فائدہ یہ ہوا کہ نئے نقاد صرف تاثر لکھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ حوالے، دلیل اور نظری بنیاد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی تراجم نے بھی بڑا کام کیا: مغربی نقادوں کے افکار اردو میں آنے سے اردو تنقید کی اصطلاحات میں وسعت آئی اور مقامی ادب کو عالمی مکالمے سے جوڑنا ممکن ہوا۔ البتہ اس عمل میں یہ خطرہ بھی رہا کہ نقاد کی اپنی زمین کمزور ہو جائے اور وہ غیر ملکی اصطلاحوں کے بوجھ تلے دب جائے۔ اس توازن کو برقرار رکھنے والے نقادوں نے سب سے زیادہ خدمت کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید نظریات نے درسی کتب اور طلبہ کی سوچ بدل دی: آج کا طالب علم کسی نظم یا افسانے کو صرف "اچھا یا برا" نہیں کہتا بلکہ اس کی ساخت، علامت، پس منظر اور مفاہیم کی تہوں پر بات کر سکتا ہے۔ تفہیم کی یہ تربیت ہی جدید تنقید کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور اسی نے اردو ادب کو نئی نسل کے لیے دوبارہ قابلِ مطالعہ اور دلچسپ بنایا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں اردو تنقید نے جدیدیت، نفسیات، سماجیات، اسلوبیات، نسائی و مابعد نو آبادیاتی سوچ اور تحقیق و تدوین جیسی نئی جہتیں اپنا کر خود کو ایک زندہ اور ترقی پذیر علم ثابت کیا ہے۔ جدید تنقیدی نظریات نے اردو ادب کی تفہیم کو وسعت، گہرائی اور نئے سوال عطا کیے ہیں۔ ان کی بدولت آج کا قاری غالب کو بھی نئی آنکھ سے پڑھ سکتا ہے اور جدید افسانے کو بھی۔ شرط صرف یہ ہے کہ نظریے کو رہنما اصول سمجھا جائے، الک نہ بنایا جائے؛ یہی رویہ پاکستانی تنقید کی مستقبل کی صحت مند سمت ہے۔

سوال نمبر 5: ادب میں "پاکستانیت" اور مختلف اصناف میں اس کی جھلک (20 نمبر)

سوال نمبر 5: ادب میں "پاکستانیت" سے کیا مراد ہے اور یہ مختلف اصناف مثلاً ناول، افسانہ، نظم اور غزل میں کس طرح جھلکتی ہے؟ نصاب کی روشنی میں جواب تحریر کریں۔

(20)

تعارف

قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب کے سامنے ایک نیا سوال پیدا ہوا: پاکستان کے ادب کی اپنی پہچان کیا ہو گی؟ اسی سوال کے جواب میں "پاکستانیت" کی اصطلاح سامنے آئی۔ یہ اصطلاح محض جغرافیائی نسبت نہیں بلکہ ایک فکری، تہذیبی اور جذباتی وابستگی کا نام ہے۔ نصاب میں پاکستانی ادب کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق ہر بڑی صنف نے اس وابستگی کو اپنے اپنے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ اس سوال میں پہلے پاکستانیت کا مفہوم واضح کیا جائے گا اور پھر ناول، افسانہ، نظم اور غزل میں اس کی جھلک کا جائزہ لیا جائے گا۔

پاکستانیت سے مراد

پاکستانیت سے مراد ادب میں وہ شعور اور اظہار ہے جو پاکستان کی سرزمین، اس کے عوام، اس کی تاریخ، تہذیب، زبانوں، رسم و رواج، مسائل اور امنگوں سے جڑا ہو۔ اس میں تحریکِ پاکستان کا پس منظر، نظریۂ پاکستان سے وابستگی اور قیامِ وطن کے بعد کی قومی زندگی کے تجربات شامل ہیں۔ مگر یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ پاکستانیت صرف وطن کی تعریف یا نعرہ

بازی کا نام ہے۔ اصل پاکستانیت یہ ہے کہ ادیب اپنے وطن کو سچائی سے دیکھے: اس کی خوبیاں بھی بیان کرے اور کمزوریوں پر تنقید بھی کرے، کیونکہ سچی محبت اندھی عقیدت نہیں ہوتی۔ اس میں علاقائی تنوع بھی شامل ہے: پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور دوسری ثقافتوں کے رنگ مل کر پاکستانی تہذیب کی تصویر بناتے ہیں، اور اردو ادب نے ان سب کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ یوں پاکستانیت ادب کی قومی شناخت کا وہ شعور ہے جو الگ وطن کے تجربے سے پیدا ہوا اور ہر صنف میں اپنے لہجے کے ساتھ ظاہر ہوا۔

ناول اور افسانے میں پاکستانیت

ناول میں پاکستانیت سب سے پہلے تقسیم و ہجرت کے تجربے کی صورت میں جھلکتی ہے۔ ندیم مستور کے "آنگن"، عبداللہ حسین کے "اداس نسلیں" اور انتظار حسین کے "بستی" نے نئے وطن کی پیدائش، اس کی قیمت اور یہاں آنے والوں کی نفسیات کو قومی یادداشت بنایا۔ شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" نے کراچی کے غریب طبقے اور نئے شہری پاکستان کی تلخ حقیقتیں دکھا کر پاکستانیت کو تنقیدی سماجی شعور سے جوڑا۔ بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" نے پاکستانی مسلمان کی اخلاقی و روحانی تلاش کو موضوع بنایا، جبکہ بعد کے ناولوں میں دہشت گردی، شہری تشدد اور نوجوان نسل کی شناخت کے مسائل بھی اسی شناخت کی نئی پرتیں ہیں۔ افسانے میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے: منٹو کے تقسیم پر افسانوں سے لے کر احمد ندیم قاسمی کے دیہی پاکستان، غلام عباس کی شہری منافقت اور انتظار حسین کی کھوئی ہوئی تہذیب کی حسرت تک، ہر افسانہ نگار نے پاکستانی انسان کے کسی نہ کسی رخ کو محفوظ کیا ہے۔ یہ افسانے بتاتے ہیں کہ پاکستانیت صرف سرحد کا نام نہیں، اس انسان کا نام ہے جو اس سرحد کے اندر جیتا، مارتا اور خواب دیکھتا ہے۔

نظم اور غزل میں پاکستانیت

نظم میں پاکستانیت کا سب سے براہ راست اظہار ملی و قومی شاعری میں ہوا۔ حفیظ جالندھری نے "شاہنامۂ اسلام" اور قومی ترانے کے ذریعے قومی تشخص کی بنیاد رکھی، جمیل الدین عالی کے ملی نغمے عام آدمی کی زبان بنے، اور فیض احمد فیض و احمد ندیم قاسمی نے وطن سے محبت کو انسان دوستی اور سماجی انصاف سے جوڑ کر اسے گہرا مفہوم دیا۔ نظم میں پاکستانیت صرف خوشی کے موقع پر نہیں جھلکتی؛ آمریت کے دور میں احتجاجی نظم نے بھی اسی محبت کا حق ادا کیا کہ وطن کے دشمن صرف باہر نہیں ہوتے، اور قوم کی خاموشی پر سوال اٹھانا بھی وطن پرستی ہے۔ احمد فراز اور منیر نیازی جیسے شاعروں نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔

غزل میں پاکستانیت بالواسطہ اور علامتی انداز میں آتی ہے کیونکہ غزل کا مزاج ذاتی و داخلی ہے۔ یہاں وطن محبوب بن جاتا ہے، شہر بچھڑنے کی اذیت بنتی ہے اور سربلندی و غلامی کے استعارے قومی کیفیت کو چھوتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی غزل میں لاہور اور اس کی گم شدہ تہذیب بسنے والوں کی اجتماعی یاد بن جاتی ہے۔ فیض کی غزل میں "وطن"، "قفس" اور "صبحِ آزادی" جیسے مفاہیم براہ راست قومی تاریخ سے جڑتے ہیں، جبکہ فراز اور جون ایلیا کی غزل میں سماجی گھٹن اور مزاحمت کی کیفیت نظر آتی ہے۔ یوں غزل نے اپنے تغزل کو برقرار رکھ کر بھی پاکستانی قاری کے قومی شعور کو آواز دی، جو اس صنف کی لچک اور پاکستانی ادب کی وسعت کا ثبوت ہے۔

پاکستانیت: تنوع اور ہم آہنگی

پاکستانیت کے مفہوم کو مکمل سمجھنے کے لیے یہ پہلو بھی ضروری ہے کہ یہ شناخت یک رنگی کا نام نہیں بلکہ تنوع میں وحدت کا نام ہے۔ پاکستانی ادب میں ایک طرف قومی زبان اردو کا مرکزی دھارا ہے تو دوسری طرف اس ادب میں سندھ کے صحرا، بلوچستان کے پہاڑ، خیبر کی وادیاں، پنجاب کے کھیت اور کراچی کی ساحلی زندگی سب کی اجتماعی جھلک ملتی ہے۔ جب ناول نگار چولستان کی پیاس لکھتا ہے یا افسانہ نگار پہاڑی علاقے کی رسموں کو بیان کرتا ہے تو وہ دراصل پاکستانیت کے اس تنوع کو محفوظ کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی تہذیب، برصغیر کی مشترکہ تاریخ اور جدید عالمی زندگی کے اثرات مل کر اس شناخت کو وہ شکل دیتے ہیں جو صرف پاکستان کے ادب میں نظر آتی ہے۔ اس شناخت میں یہ وسعت بھی ہے کہ پاکستانی ادیب اپنے ملک کی خامیوں پر طنز و تنقید کو بھی اسی وابستگی کا حصہ سمجھتا ہے؛ مثلاً طنزیہ کالم، احتجاجی نظم اور سماجی ناول وطن سے بیزاری نہیں بلکہ وطن کو بہتر دیکھنے کی خواہش کا اظہار ہیں۔ اس لیے پاکستانیت کو کسی تنگ نظری کے سانچے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زندہ اور ترقی پذیر شعور ہے جو ہر نسل کے ادیب کے ہاں نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اور یہی شعور پاکستانی ادب کو بین الاقوامی ادبی منظرنامے میں الگ پہچان عطا کرتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستانیت سے مراد ادب میں پاکستانی زمین، عوام، تاریخ اور شناخت سے سچی وابستگی کا وہ شعور ہے جو حب الوطنی کے ساتھ تنقیدی سچائی کو بھی شامل رکھتا ہے۔ یہ شعور ناول میں ہجرت و نئی زندگی کی داستان بن کر، افسانے میں عام پاکستانی کی نفسیات بن کر، نظم میں قومی و احتجاجی آواز بن کر اور غزل میں علامتی محبت و حسرت بن کر جھلکتا

ہے۔ نصاب کے منتخب نمونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستانی ادب محض برصغیر کی اردو روایت کی توسیع نہیں بلکہ اپنی الگ شناخت رکھتا ہے، اور یہی الگ شناخت ہی پاکستانیت ہے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com